بیادگار: عمدۃ الصوفیاء سید الاتقیاء صفی ملّت حضرت سیّد صوفی صفی احمد چشتی سہروردی صاحب نوّر اللہ مرقدہٗ

دینی مدارس کا نظام تعلیم

اور عصر حاضر کے تقاضے

کمال احمد علیمی نظامی

استاذ دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی یوپی

اشاعت بموقع

جشن دستار علم وفضل شہزادہ صفی ملت، حضرت مولانا سید اکرام صفی بختیار میاں چشتی علیمی زید مجدہٗ

نائب سجادہ نشین خانقاہ عالیہ چشتیہ سہروردیہ درگاہ خلیل پور چفری، اٹرام پور، الہ آباد، یوپی M : 9621870786

نام کتاب: دینی مدارس کا نظام تعلیم اور عصر حاضر کے تقاضے

مصنف: کمال احمد علیمی نظامی استاذ دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی

تزئین: مولانا غلام غوث طرب علیمی استاذ دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی

اشاعت بموقع: جشن دستار فراغت شہزادۂ صفی ملت، حضرت مولانا سید اکرام صفی بختیار میاں زید مجدہ، منعقدہ ۲۹/جنوری ۲۰۲۰ء بمقام دار العلوم علیمیہ جمدا شاہی بستی

صفحات: ۲۴ سن اشاعت: ۲۰۲۰ء

فہرست

نذرانۂ عقیدت

سید الصوفیاء، عمدۃ الاتقیاء، حضرت سید شاہ صفی احمد چشتی، سہروردی نور اللہ مرقدہ الشریف (متوفی ۲۸/جنوری ۲۰۱۷ء) کی بارگاہ میں۔

جنھوں نے پوری زندگی سادگی اور تواضع کے ساتھ گزاری، جن کی خاموشی میں شورِ علم، فقیری میں امیری اور سادگی میں شاہانہ جاہ وجلال نمایاں تھا، جنھوں نے گاؤں گاؤں اور گھر گھر جا کر سلسلۂ چشتیہ سہروردیہ کی نشر واشاعت فرمائی، حق گوئی جن کا طرۂ امتیاز تھا، تقویٰ جن کا شعار تھا، جو یقیناً نمونۂ اسلاف تھے، جنھوں نے نہ جانے کتنے گم گشتگان راہ کو ساحل ہدایت سے ہم کنار کیا، شدید مشکلات میں بھی جنھوں نے شریعت واستقامت کا دامن تھامے رکھا۔

عقیدت کیش

کمال احمد علیمی نظامی

انتساب

اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کے نام جنھوں نے سب سے پہلے دینی مدرسے کا خوبصورت تصور پیش کیا، جنھیں براہ راست مشکاۃ نبوت سے فیضیابی کی سعادت ملی، جنھوں نے سب سے پہلے اسلامی مدرسے میں طلب علم کا اعزاز حاصل کیا، اور جن کے واسطے دینی مدارس کا شجرہ ہادی برحق، معلم کائنات، محسن اعظم انسانیت حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جا ملتا ہے۔

اہل سنت کا ہے بیڑا پار اصحاب حضور

نجم ہیں اور ناؤ ہے عترت رسول اللہ کی

ان دو مقدس ہستیوں کی خدمت میں....

جن کے صدقے مجھے جامۂ وجود ملا....

میری ہر سانس جن کا مرہون منت ہے....

میں جو بھی ہوں بس انھیں سے ہوں....

میرا جو بھی ہے سب انھیں کا ہے....

جن کی دعاے صبح گاہی اور نالہ شبی سے میں، میں ہوں....

جن کی خوشی، رب کی خوشی....

جن کی ذات رب کی نعمت....

جن کی مسکراہٹ زندگی کا حاصل....

جن کا دست شفقت سائبان رحمت....

اور جن کی رضا سرمایۂ آخرت ہے....

یعنی....

میرے والدین کریمین

جو اس دنیا میں میرے لئے سب سے زیادہ اہم اور اکرم ہیں۔ رب رحیم ان کا سایۂ شفقت مجھ پر دراز فرمائے، میری عمر ان کو لگ جائے۔

کمال احمد علیمی نظامی

بنام جہاں دار جاں آفریں

دینی مدارس اسلامی تعلیمات اور دینی اقدار و روایات کی نشر واشاعت کا خوبصورت سر چشمہ ہیں۔ ان مدرسوں میں کتاب وسنت کی تعلیم کے ذریعے نسل انسانی کو نہ صرف ایک سچا پکا مسلمان بنایا جاتا ہے، بلکہ اسے کامل انسان بھی بنایا جاتا ہے۔ ان مدارس کی فیض رسانی ہر دور میں مسلم رہی ہے۔

دیگر تعلیمی اداروں کی طرح ان مدارس کا بھی ایک نظام تعلیم وتربیت ہے، اس نظام تعلیم کی بنیاد توحید ورسالت، تصور آخرت اور پاکیزہ معاشرت پر ہوتی ہے۔ اس نظام تعلیم کا مقصد اصلی ایک عام انسان کو اللہ رب العزت کا صالح بندہ بنانا ہے، اس نظام تعلیم کی بنیادی عناصر کتاب وسنت کی تعلیم، اور انسان کی سیرت سازی ہے۔

دینی مدارس کا نقطہ آغاز ”صفہ نبوی“ ہے، یہ اسلام کی اولین درس گاہ تھی، جہاں کے فیض یافتہ لوگوں میں عظیم مفسر، محدث، سیاست داں، سپہ سالار، اور مفکر و دانشور شامل ہیں، یہ اسلامی نظام تعلیم ہی کا فیض تھا کہ دنیا میں حضرت ابوبکر جیسے عظیم مدبر اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما جیسے بلند ہمت سیاست داں پیدا ہوئے، اور اسی نظام تعلیم کے ذریعے ان میں وہ عظیم علمی انقلاب برپا ہوا جس کے اثرات آج بھی واضح طور سے محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

کسی بھی علمی ادارے کا معیار تعلیم اس کے نظام تعلیم پر منحصر ہوتا ہے، اگر نظام تعلیم معیاری مفید، اور نفع بخش ہوتا ہے تو اس ادارے کا تعلیمی معیار بھی بلند، مفید اور نفع بخش ہوتا ہے۔ اسی لئے شروع ہی سے دینی مدارس میں ایسا نظام تعلیم رکھا گیا جس کے ذریعے انسان کو نہ صرف عالم بنایا جائے بلکہ اسے سماج و معاشرہ اور دین و دنیا دونوں کے لئے کارآمد اور مفید فرد بھی بنایا جائے۔

دینی مدارس کا قدیم نظام تعلیم:

دینی مدارس کے جدید نظام تعلیم اور اس کے عصری تقاضوں کو سمجھنے سے پہلے ہمیں دینی مدارس کے قدیم نظام تعلیم کو سمجھنے کی ضرورت ہے، تاکہ موجودہ نظام تعلیم میں عصری تقاضوں کے لحاظ کی نوعیت وکیفیت طے کرنے میں آسانی رہے۔

عصر حاضر کی طرح قدیم زمانے میں باضابطہ مدارس کا وجود بہت کم تھا۔ مدارس کی دنیا مساجد، خانقاہوں اور مقبروں میں آباد تھی، پانچوی صدی ہجری سے عالم اسلام میں با ضابطہ مدارس کا آغاز ہوا، علیحدہ درس گاہی عمارتوں کا وجود عمل میں آیا۔ مدارس کے قواعد و ضوابط بنائے گئے، دار الاقاموں کی بنیاد ڈالی گئی۔ تنخواہوں پر پڑھانے کا رواج ہوا، مختلف علوم کے مدارس ومعاہد کا قیام ہوا، نصاب تعلیم کے لئے چیدہ کتابیں منتخب کی گئیں۔ ہر فن میں بڑھانے کے لئے مختصر رسالے تیار کئے گئے۔

امتحان کا کوئی نظام نہیں تھا، روزانہ درس گاہ میں تعلیم ہوتی، اور بحث وتمحیص کے ذریعے امتحان بھی ہوتا، اس وقت طلبہ کتابیں حصول علم کے لئے پڑھتے تھے۔ امتحان دینے یا ڈگری حاصل کرنے کے لئے نہیں، درجہ بندی کا کوئی تصور نہیں تھا، اساتذہ کے لئے حکومت وقت کی طرف سے وظائف مقرر ہوتے، یا علاقے کے بااثر لوگوں کی مالی سرپرستی حاصل ہوتی، طلبہ سے کوئی فیس نہیں لی جاتی تھی۔ جب کہ بسا اوقات مدرسہ یا اس کے اساتذہ طلبہ کی مالی کفالت کرتے، ہمیں تاریخ میں کچھ ایسے مخلص اساتذہ بھی ملتے ہیں جو اپنے گھر پر رکھ کر طلبہ کو پڑھاتے تھے، اور ان کا خرچ بھی اٹھاتے تھے۔

دینی مدارس کا یہ غیر منظم نظام تعلیم کس قدر بافیض تھا کہ اسی نظام تعلیم سے بڑے سے بڑے محدث ومفسر، عظیم ترین قائدین، بلند فکر سیاست داں، ماہر ڈاکٹر وانجینئر پیدا ہو رہے تھے۔ گویا یہ نظام تعلیم اپنے دور کے اعتبار سے کامل اور عصری تقاضوں سے ہم آہنگ تھا۔

یہی نظام تعلیم پورے عالم اسلام میں رائج تھا۔

ہندوستان میں دینی مدارس اور ان کا نظام تعلیم:

ہندوستان میں باضابطہ دینی مدارس کا آغاز سلطان محمود غزنوی کے دور میں ہوا، پانچوی صدی ہجری میں انہوں نے باضابطہ مدرسے کی بنیاد ڈالی، اس کے بعد مسلم سلاطین نے بھی مدارس کی تعمیر وترقی پر کافی توجہ دی، خاص طور سے سلطنت مغلیہ میں بہت سارے مدارس کا تذکرہ ملتا ہے۔ ان مدارس میں بھی تعلیم وتربیت کا وہی نظام رائج تھا جس کا میں نے ذکر کیا۔ قرآن وحدیث اور فقہ کی تعلیم کو اساسی حیثیت حاصل تھی، نحو، ادب، بلاغت،

کلام، اور تصوف کے مضامین بھی داخل درس تھے۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کے بعد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کوششوں سے علم حدیث کو نصاب تعلیم میں خاطر خواہ جگہ دی گئی، مگر بارہویں صدی عیسویں سے پہلے تک مدارس کا باضابطہ نصاب و نظام مرتب نہیں کیا گیا تھا۔ بارہویں صدی ہجری میں ''درس نظامی'' کے بانی ملا نظام الدین فرنگی محلی نے باضابطہ نصاب تعلیم کی ترتیب کا فریضہ انجام دیا۔ اور اس کے بعد مدارس کے نظام تعلیم میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے شکست کے بعد بھی دینی مدارس نے اپنا وجود باقی رکھا۔ اور دینی نظام تعلیم کے ساتھ ان مدارس میں قال اللہ وقال الرسول کی صدا بلند ہوتی رہی، ۱۸۶۷ء میں ہندوستان کے مدارس کے نظام تعلیم میں کچھ باضابطگی پیدا ہونے لگی، جب دارالعلوم دیوبند کا قیام عمل میں آیا، جس میں پہلی بار متعدد فنون کے اساتذہ، جماعت بندی، شعبوں کی تعیین، نظام امتحان، نظام تعطیلات کا باقاعدہ التزام کیا گیا۔ اس کے بعد ہندستان میں بہت سارے مدارس کا جال بچھ گیا۔ اور سب میں تقریباً یکساں نظام تعلیم کا رواج ہوا۔

۱۸۹۸ء میں جب ندوۃ العلما کا قیام ہوا تو دینی مدارس میں پہلی بار باضابطگی کے ساتھ عصری تقاضوں کا لحاظ کیا گیا، نصاب تعلیم کو قدیم صالح اور جدید نافع کا سنگم بنایا گیا۔

آج ہندوستان میں مختلف مسالک و مکاتب فکر کے سیکڑوں مدرسے ہیں، جن میں کچھ کمی وبیشی کے ساتھ تقریباً ایک ہی طرح کا نصاب تعلیم، نظام امتحان، نظام رہائش اور نظام تعطیل وغیرہ رائج ہے۔

دارالعلوم دیوبند، ندوۃ العلما، جامعہ اشرفیہ مبارک پور، دارالعلوم علیمیہ جمدا شاہی، جامعہ امجدیہ گھوسی، دارالعلوم فیض الرسول براؤں شریف، جامعہ اسلامیہ روناہی، اور دیگر مدارس یہ ہندوستان کے بڑے اور نامور مدارس ہیں جن کے نظام تعلیم کی تقلید میں آج تقریباً تمام ہندستانی مدارس میں تعلیم و تعلم کا سلسلہ جاری ہے۔

ذیل میں، میں عصر حاضر میں دینی مدارس کے رائج نظام تعلیم سے متعلق چند اہم

امور کا جائزہ اور ان سے متعلق عصر حاضر کے تقاضوں کا تذکرہ کر رہا ہوں۔

نصاب تعلیم:

کسی بھی نظام تعلیم میں نصاب تعلیم کو ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت حاصل ہے۔ پورے نظام تعلیم کا ڈھانچہ اسی کے سہارے قائم رہتا ہے۔ نصاب تعلیم کا کمال و نقص براہ راست نظام تعلیم میں مؤثر ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں دینی مدارس میں رائج نصاب تعلیم کے مرتب و بانی عہد عالمگیری کے معروف محقق و ماہر تعلیم ملا نظام الدین فرنگی محلی ہیں۔ بارہویں صدی میں تیار کردہ یہ نصاب تعلیم کچھ ردو بدل کے ساتھ آج بھی دینی مدارس میں رائج ہے۔ اس نصاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اپنے دور کا کامل ترین، اور عصری تقاضوں سے بھرپور نصاب تعلیم تھا۔ بانیٔ نصاب نے اپنے زمانے کے تقاضوں سے چشم پوشی کرنے کے بجائے اس دور میں جن مضامین وفنون کی ضرورت تھی ان کا مکمل لحاظ فرمایا تھا۔

چونکہ اس دور میں معقولات کا دور دورہ تھا، معقولات میں رسوخ اور تبحر کے بعد ہی کسی کو ’عالم دین‘ مانا جاتا تھا۔ اس لئے اس دور کا تقاضہ تھا کہ نصاب میں معقولات کو حسب حیثیت جگہ دی جائے۔ چنانچہ ایسا کیا بھی گیا۔ یوں ہی فارسی زبان اس دور کی سرکاری اور دفتری زبان تھی۔ اس لئے عربی زبان کے ساتھ فارسی زبان کی تعلیم کو بھی نصاب کا جزو لازم قرار دیا گیا، اسی طرح سے بعد کے ادوار میں فن طب، ریاضی اور دیگر عصری و دنیوی علوم کو اس نصاب کا حصہ بنایا گیا جو صرف عصری تقاضے کے تحت تھا۔

مذکورہ حقائق سے اتنی بات تو طے ہو چکی کہ نصاب تعلیم میں عصری تقاضوں کی رعایت ہمارے اسلاف کی عادت کریمہ رہی ہے، اس لئے ہمیں بھی اسی روش پر چلنا چاہئے، تاکہ ہم بھی اپنے دور کے ترقی یافتہ سماج کا حصہ بن سکیں اور ہمارا تعلیمی نظام جمود و تعطل کا شکار نہ ہو۔

میں نصاب تعلیم میں کلی تبدیلی کا قائل نہیں۔ مگر جزوی تبدیلی اور حسب ضرورت ترمیم ناگزیر ہے، ہاں اتنی بات ضرور ملحوظ رہے کہ دینی مدارس کا نصاب تعلیم دینی ضرورتوں

کی تکمیل کے لئے ہے، اس کا مقصد اصلی دین کی تعلیم ہے، اس لئے دینیات سے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ ہاں دینیات کی مشکل کتابوں کو آسان لب و لہجے اور عام فہم زبان میں پڑھایا جائے تو اس سے تعلیم میں مزید آسانی پیدا ہو سکتی ہے۔

اس سلسلے میں اگر یہ اصول اپنا لیا جائے کہ دینیات کو جوں کا توں رکھتے ہوئے ان مضامین میں ترمیم و تبدیلی کا عمل اپنایا جائے جو کسی دور میں اس دور کے تقاضے کے تحت رکھے گئے تھے، تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہوگا۔ مثلاً معقولات کی بہت ساری کتابیں اب کسی دوسری دنیا کی کتابیں لگتی ہیں، دقیق معانی، پیچیدہ عبارات، روایتی خیالات سے بوجھل یہ کتابیں اسی دور کا تقاضہ تھیں، جب ان کے فہم و تفہیم کو قابلیت اور علمی صلاحیت کی سند سمجھا جاتا تھا۔ اب زمانہ بدل چکا ہے، نہ تو ان کتابوں کی عقدہ کشائی کرنے والے ماہرین رہے نہ ہی ان کو پڑھنے کے شوقین طلبہ۔ اس لئے اگر اب بھی ہم ان کتابوں کو زینت درس بناتے رہے تو یہ عصر حاضر کے تقاضوں سے چشم پوشی، اور اسلاف کی سنت سے انحراف ہوگا۔

واضح رہے کہ فن منطق و فلسفہ آج بھی ہمارے دینی علوم میں کافی حد تک دخیل ہے، اور فکری غلطی سے بچنے، اور ذہنی مشق و ممارست کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اس لئے اس فن کو اب بھی داخل نصاب رکھنا ضروری ہے، مگر بس اس حد تک کہ ضرورت پوری ہو جائے، اس کے لئے منطق و فلسفہ کی چند ابتدائی کتابیں بالاستعیاب پڑھا دی جائیں، اور اس کے مصطلحات یاد کرا دیے جائیں۔ نیز اگر ممکن ہو تو مناطقہ و فلاسفہ کے ملحدانہ اور گمراہ گر عقائد اور ان کی تردید سے طلبہ کو واقف کرا دیا جائے۔

نصاب تعلیم میں سائنس کی شمولیت:

منطق و فلسفہ نظریاتی فن ہیں۔ آج زمانہ نظر سے زیادہ عمل و تجربہ پر زور دیتا ہے، قدامت سے جدت کی طرف بلاتا ہے اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ منطق و فلسفہ کی دقیق بحثوں میں ضرورت سے زیادہ نظر و فکر کرنے کے بجائے عمل کی دنیا میں قدم رکھا جائے، تھیوری کی بجائے پریکٹیکل پر زور دیا جائے۔ فلسفہ کو قدیم سائنس کہا جاتا ہے، گویا

ہمارے اسلاف نے اپنے دور کی سائنس کو داخل درس کیا تھا۔ تو کیا حرج ہے اگر ہم اپنے زمانے کی سائنس کو نصاب کا حصہ بنائیں، نظریات میں حد سے زیادہ سر مارنے کے بجائے عملیات میں قوت فکر اور طاقتِ بازو کا استعمال کریں۔ ''نظریاتی سائنس کے بجائے تجرباتی سائنس'' سے فائدہ اُٹھائیں۔

آج دینی مدارس میں سائنس کی تعلیم کے بارے میں اہل علم دو طبقوں میں منقسم ہیں، کچھ کا یہ کہنا ہے کہ عصر حاضر میں سائنس کی اہمیت وافادیت کو دیکھتے ہوئے دینیات میں کسی طرح سائنس کو بھی داخل نصاب کیا جائے، جبکہ دوسرے طبقے کی رائے یہ ہے کہ سائنس اور دیگر دنیاوی علوم ''شجر ممنوعہ'' ہیں، دینی مدارس میں ان کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ فقیر کی رائے یہ ہے کہ دونوں نظریہ صحیح نہیں ہیں، اول اس لیے کہ یہ دینی مدارس کے مقصد اساسی کے خلاف ہے، ثانی الذکر اس لیے کہ یہ عصری تقاضے سے چشم پوشی ہے، جو اسلام کی فطرت وطبیعت کے خلاف ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دینی مدارس کو اہل اسلام نے اس لیے قائم کیا تھا کہ ان سے دینی تعلیم کی ترویج واشاعت ہو، دینی علوم میں تفسیر، حدیث، فقہ اور ان کے اصول اور علم عقائد کو کلیدی حیثیت حاصل ہے، باقی علوم کی تعلیم یا تو بطور معاونت وسیلے کے طور پر یا پھر عصری تقاضے کے لحاظ میں ہے۔ اس لیے دنیاوی تعلیم مثلاً ڈاکٹری، انجینیرئینگ، سائنس وغیرہ کی تعلیم کو وہ درجہ نہیں دیا جا سکتا ہے جو دینی علوم کو دیا گیا ہے، یہ دینی مدارس کی روح کے خلاف ہوگا، جب دنیاوی اداروں میں دینی علوم کو دنیوی علوم کا درجہ نہیں دیا جاتا ہے، تو پھر مدارس سے یہ توقع رکھنا ناانصافی ہوگی کہ وہ دنیوی علوم کو دینی علوم کا درجہ دیں گے، نہ تو کسی مدرسہ کا نظام تعلیم ایک ڈاکٹر، انجینئر پیدا کر سکتا ہے، نہیں کسی یونیورسٹی کا نصاب تعلیم ایک فقیہ ومفتی بنا سکتا ہے، اس لیے دنیاوی علوم کو دینی علوم کا درجہ دینے کے مطالبے پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

دوسرا نظریہ بھی ناقابل تسلیم ہے، دین میں دنیا کو بھی حیثیت دی گئی ہے، اسلاف کرام سے ثابت ہے کہ انھوں نے قرآن وسنت کے ساتھ طبابت، زراعت اور حرفت و

صنعت کی بھی تعلیم حاصل کی ہے، اس لئے اس نظریہ پر کہ سائنس دنیاوی علوم ہے، اس لئے ہم اس کو دینی مدارس میں جگہ نہیں دے سکتے نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

ایک بہترین معتدل راہ یہ نکل سکتی ہے کہ دینی مدارس کے ابتدائی درجات میں سائنس کی اصطلاحات ومبادیات سے طلبہ کو آگاہ کرا دیا جائے، درجات فوقانیہ میں سائنس کے عام بنیادی نظریات سے واقف کرا دیا جائے، اور درجاتِ عالیہ میں سائنس کے تجرباتی مباحث کی تعلیم کے ساتھ اس کے ملحدانہ وگمراہ گر عقائد وافکار کو پڑھا کر ان کی تردید کا طریقہ سکھا دیا جائے، مثلاً سائنس کا یہ نظریہ ہے کہ انسان بندر کی اولاد ہے، اسے ضرور پڑھایا جائے مگر اس کی تردید بھی ہو، کہ انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہے، بندر کی نہیں، یوں ہی زمین وآسمان کی حرکت یا سکون، جزء لایتجزیٰ، آغاز وجود عالم اور تصور آخرت کے بارے میں سائنسی نظریات پڑھا کر ان کی تردید کی جائے، اس طرح سے سائنس کی تعلیم بھی ہو جائے گی اور دین کا کام بھی۔

سائنس کی تعلیم مندرجہ ذیل مقاصد کے تحت ہو تو زیادہ بہتر ہوگا۔

(۱) کائنات اور آفاقِ عالم میں پھیلی ہوئی قدرت کی صنعت کاریوں اور پردۂ جہاں میں مخفی اسرار ورموز کو آشکار کر کے وجود صانع، یعنی اللہ ربُّ العزت کے وجود پر استدلال۔

(۲) قرآن وحدیث میں موجود سائنسی حقائق کی توضیح وتشریح۔

(۳) سائنس کے ملحدانہ عقائد کی تردید۔

(۴) تحقیق وجستجو کی صلاحیت پیدا کرنے کی تعلیم وتلقین۔

نصاب تعلیم میں دیگر دنیوی علوم کی شمولیت:

احیاء العلوم میں امام غزالی نے دنیوی علوم کی تحصیل کے بارے میں صحیح اسلامی نقطۂ نظر پیش فرمایا ہے، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض دنیوی علوم مثلاً علم طبابت، ریاضی، کاشتکاری، پارچہ بافی، حجامت اور خیاطی وغیرہ کی تحصیل فرض کفایہ ہے کہ اگر شہر میں کوئی ان علوم کو نہ حاصل کرے تو عوام الناس مشقت میں پڑ جائیں گے۔ اور بعض علوم کی تحصیل افضل ہے مثلاً علم حساب وطب میں باریکیاں پیدا کرنا کہ ان کے جاننے سے فائدے میں اضافہ ہوگا۔ اور بعض علوم کی تحصیل مباح ہے مثلاً شعر گوئی کی تعلیم یا تاریخ کا علم۔ بعض علوم

کی تحصیل ناپسندیدہ ہے مثلاً جادو وغیرہ کا علم۔(اسلامی نظام تعلیم: ۷۲)

مذکورہ تفصیل سے اتنی بات واضح ہوگئی کہ دین میں دنیوی علوم کی تحصیل ناجائز وحرام نہیں ہے، بلکہ بعض مواقع پر فرض کفایہ ہے، اسی وجہ سے عہد قدیم کے نصاب تعلیم میں طب وغیرہ کی تعلیم باضابطہ داخل تھی، ''مدارس طبیہ'' کے قیام کا رواج تھا، بغداد، قرطبہ اور دیگر اسلامی شہروں میں سپہ گیری اور جنگی تربیت کے مدارس کا قیام تھا۔ یوں ہی ساتویں صدی ہجری میں سلطان عثمان بن ارطغرل نے جو مدرسہ قائم کیا اس میں بھی دینی علوم کے ساتھ سپہ گیری کی تعلیم دی جاتی تھی، غرناطہ میں ۱۳۴۳ء میں ایک عظیم الشان یونیورسٹی قائم ہوئی جسے ہم اس دور کا ترقی یافتہ مدرسہ کہہ سکتے ہیں، اس میں طب، کیمیا، فلسفہ اور نجوم جیسے اہم علوم پڑھائے جاتے تھے۔(دینی مدارس اور عصر حاضر کے تقاضے: ۴۴)

اس لئے عصر حاضر میں اگر مدارس کی تعلیم میں دینی علوم کے ساتھ پیشہ وارانہ کورسیز اور دیگر دنیوی علوم کو مناسب جگہ دی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، بشرطیکہ دینیات کی تعلیم متأثر نہ ہو۔

انگریزی زبان کی تعلیم کا مسئلہ:

گزشتہ سطور میں، میں نے عرض کیا کہ بارہویں صدی عیسوی میں ملا نظام الدین نے جو دینی مدارس کا نصاب تیار کیا تھا اس میں عربی کے ساتھ فارسی زبان کو معقول جگہ دی گئی تھی، اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ یہ اس دور کی رائج اور دفتری زبان تھی، عصر حاضر میں انگریزی زبان عالمی زبان ہے، بغیر اس کی تحصیل کے ہم نہ تو اپنی بات عالمی سطح پر عام کر سکتے ہیں اور نہ ہی دعوت وتبلیغ میں کوئی قابل قدر کارنامے انجام دے سکتے ہیں، اس لئے ہم پر لازم ہے کہ ہم جس طرح عربی زبان کی تحصیل پر توجہ دیتے ہیں یوں ہی انگریزی اور ہندی زبان کی تعلیم پر توجہ دیں، یہ صرف دنیوی تقاضہ ہی نہیں بلکہ دینی تقاضہ بھی ہے۔

انگریزی کی تعلیم درج ذیل مقاصد کے تحت ہو:

(۱) دعوت وتبلیغ، (۲) آفیسوں اور سرکاری دفتروں سے متعلق امور کو سمجھنا کہ آج ہمارے طلبہ آفیسوں، دفتروں اور ائرپورٹس پر جانے سے اسی لیے گھبراتے ہیں کہ ان کی زبان انگریزی نہیں ہوتی ہے۔ (۳) انگریزی لٹریچر میں موجود اسلام کے خلاف ہرزہ سرائیوں کا جواب (۴) مستشرقین کے ذریعے اسلام پر کیے گئے اعتراضات اور ان کی زہر

افشانیوں کا معقول جواب (۵) کمپیوٹر اور انٹرنیٹ سے استفادہ جو وقت کی بہت بڑی ضرورت ہیں۔

انگریزی کا طریقۂ تعلیم مدارس میں کچھ اس طرح سے ہونا چاہیے:

(۱) انگریزی گرامر بس بقدر ضرورت پڑھایا جائے، اسی کو مقصود نہ بنایا جائے (۲) پڑھنے لکھنے سے زیادہ بولنے پر زور دیا جائے۔ (۳) صحیح تلفظ اور لہجے نیز طرز ادائیگی پر دھیان دیا جائے۔ (۴) خاص الفاظ وتراکیب اور رائج زبان پر توجہ دی جائے (۵) انگریزی اخبارات کے مطالعہ کی عادت ڈلوائی جائے۔

دینی مدارس میں جسمانی ریاضت اور کھیل کود:

مسلسل کام کرنے سے طبیعت میں اضمحلال اور پژمردگی پیدا ہوتی ہے، جسم میں تکان کا احساس ہوتا ہے، ذہن میں اس کام سے بےزاری پیدا ہوتی ہے، اس لئے عہد قدیم ہی سے دینی مدارس کے نظام تعلیم میں جسمانی ریاضت اور بقدر ضرورت سیر وتفریح رائج ہے، چنانچہ معروف ماہر تعلیم اور آٹھویں صدی ہجری کے عظیم محقق ومدرس قاضی ابن جماعہ اس حوالے سے رقمطراز ہیں:

"ٹہلنے اور جسم کی ریاضت کرنے میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ وہ حرارت برانگیختہ کرتے ہیں، ردی فضلات زائل کرتے ہیں اور بدن میں نشاط پیدا کرتے ہیں" (اسلامی نظام تعلیم ۷۴)

مزید فرماتے ہیں:

"اگر دل ودماغ اور ذہن ونگاہ تھک جائے یا کمزوری معلوم ہو تو سیر گاہوں میں سیر اور تفریح کرنے میں کوئی حرج نہیں، تاکہ پہلی حالت پھر لوٹ آئے" (۷۵)

یوں ہی ابتدائے اسلام سے جسمانی ریاضت کا عمل منقول ہے، چنانچہ خود نبیٔ کریم علیہ السلام سے گھوڑ دوڑ، اور فن سپہ گری کی ریاضت ثابت ہے، امام شافعی اپنے زمانے کے منفرد المثال تیر انداز تھے۔

لہذا مدارس کی دنیا میں اس پہلو پر توجہ دی جائے تو بہتر ہوگا۔ ہاں ان چند امور کا لحاظ رکھا جائے:

(۱) خلاف شریعت امور کا ارتکاب نہ ہو، مثلاً کھیل کود میں کشف ستر نہ ہو۔ (۲)

بہت زیادہ وقت نہ صرف کیا جائے، کہ تعلیمی مشاغل متاثر ہوں۔ (۳) بچوں کی صحت متاثر نہ ہو۔ (۴) طلبہ کے ذہن میں یہ بٹھا دیا جائے کہ کھیل کود اور جسمانی ریاضت کا مقصد بس نشاط انگیزی اور ان کا موڈ بدلنا ہے اس کے سوا کچھ نہیں۔

دینی مدارس کا طریقۂ تدریس:

دینی مدارس کا موجودہ طریقۂ تعلیم کیا ہے، اور اس میں کیا اچھائیاں اور کمیاں ہیں، اس پر بحث کرنے کے بجائے بہتر یہ ہے کہ صحیح طریقۂ تدریس پیش کر دیا جائے۔ طریقۂ تدریس سے متعلق علامہ ابن خلدون فرماتے ہیں:

”مختصرات کو پڑھانے کی بجائے طویل الذیل کتابوں کو پڑھایا جائے، علوم مقصودہ بالذات پر خصوصی توجہ دی جائے، تھوڑا تھوڑا تدریجاً پڑھایا جائے، ہر فن کے چند اصولی مسئلے ذہن نشیں کرا دیے جائیں، جو اجمالی ہوں ان کی شرح کی جائے، طلبہ کی قوت فہم کا لحاظ رکھا جائے، ایک فن سے دوسرے فن کی طرف رجوع کیا جائے، شروع میں ہلکے مسائل سمجھائے جائیں“ (ملخص اسلامی نظام تعلیم ۱۵۳)

قاضی ابن جماعہ فرماتے ہیں:

”اساتذہ کو بار بار نہ بدلا جائے، علم کو کتاب میں منحصر نہ سمجھا جائے، دو فنون کو ایک ساتھ پڑھانے کی بجائے یکے بعد دیگرے پڑھایا جائے“

عصر حاضر میں تدریس میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے تو بہتر ہوگا:

(۱) طلبہ سے باضابطہ عبارت خوانی کرائی جائے۔ (۲) صحیح عبارت پڑھنے پر حوصلہ افزائی اور غلط پڑھنے پر اصلاح کی جائے۔ (۳) پڑھایا ہوا سبق سننے کا التزام کیا جائے۔ (۴) پچھلا ضرور دہرایا جائے۔ (۵) طلبہ کے اندر تجسس اور اشتیاق پیدا کر کے پڑھایا جائے۔ (۶) آموزش کا سازگار ماحول بنایا جائے۔ (۷) تدریس کو بوجھ نہ بنا کر ہنس کھیل کر ہلکے پھلکے انداز میں پڑھایا جائے۔ (۸) توضیحی آلات مثلاً بلیک بورڈ، نقشے، اور عصری ایجادات کی مدد سے پڑھایا جائے۔ (۹) تدریس وقت پر شروع اور وقت پر ختم کی جائے۔

دینی مدارس میں نظام تربیت:

تعلیم کے ساتھ تربیت لازمی ہے، آج بیشتر دینی مدارس کو اس بات پر توجہ دینے

کی ضرورت ہے۔تعلیم ایک نظری چیز ہے جس کی عملی مشق تربیت ہی ہے۔آج دینی مدارس میں نماز کے مسائل کو پڑھا کر بتانے سے زیادہ ان مسائل پر عمل کرانا سودمند ہوگا۔

قدیم نظام تعلیم میں عموما درس گاہ ہی میں تربیت کا اہتمام ہوتا تھا، چنانچہ حلقۂ درس میں جب طلبہ آتے تھے تو انہیں اٹھنے بیٹھنے، بات کرنے، بڑے سے سوال پوچھنے، چھوٹے پر شفقت کرنے اور سلام کرنے کے آداب سکھائے جاتے تھے۔مگر اب چونکہ دینی مدارس ہی میں دارالاقاموں میں طلبہ کی رہائش ہوتی ہے، اور درس گاہ میں زیادہ توجہ تعلیم ہی پر دی جاتی ہے۔اس لئے عصر حاضر میں اگر تربیت میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے تو بہت بہتر ہوگا:

(۱) بچوں کا طرز فکر، نظریۂ حیات، اور معیار امتیاز و انتخاب ایسا بنایا جائے جوان کے مقصد موجود سے مطابقت رکھتا ہو۔(۲) ان کی کوتاہیوں اور کمزوریوں کی مناسب طریقے سے اصلاح کی جائے۔(۳) صبر و استقلال سے پسندیدہ عادات ڈلوائی جائیں۔(۴) استعداد کے مطابق ان کے مشاغل و مصروفیات طے کیے جائیں۔(۵) چلنے پھرنے، رہنے سہنے اور سونے جاگنے کے مہذب اسلامی طریقے بتائے جائیں۔(۶) شاندار مستقبل میں یقین دلایا جائے۔(۷) بچوں سے برتاؤ میں مشفق معلم و مربی اور مستبد حاکم کے فرق کو ملحوظ رکھا جائے۔(۸) موبائل وغیرہ کا استعمال بقدر ضرورت کرنے کی تلقین کی جائے۔(۹) درس کے علاوہ دیگر اوقات میں ان کی نگرانی کی جائے۔(ملخصاً فن تعلیم وتربیت ۱۴۱ تا ۱۵۴)

یہاں پر ایک بات عرض کردوں کہ اخلاقی اقدار کی گراوٹ، اور بدعملی و بے عملی کے اس خطرناک دور میں تصوف کی تعلیم بے حد مفید ثابت ہوگی، اگر تصوف کی کتابیں داخل درس کردی جائیں تو ان کی مدد سے طلبہ کی اچھی تربیت کی جاسکتی ہے۔

دینی مدارس میں نظام تادیب:

تادیب کے لغوی معنی ادب سکھانے کے ہیں، یہاں پر اس سے مراد غلطی کرنے پر بچے کو سرزنش کرنا ہے۔مدارس میں پہلے مارنے پیٹنے کا رواج تھا، مگر بروقت اس میں کافی تبدیلی آئی ہے۔

مدارس میں نظام تادیب کے حوالے سے قاضی ابن جماعہ فرماتے ہیں:

''اگر کسی طالب علم سے کوئی بات تہذیب کے خلاف سرزد ہو تو اس شخص کے سامنے نرمی سے سمجھایا جائے، جس کے سامنے بدتہذیبی کی گئی ہو، اگر وہ باز نہ آئے تو پوشیدہ طور پر اسے سمجھایا جائے، اگر یہ بھی کارگر نہ ہو تو اسے سخت الفاظ میں اعلانیہ تنبیہ کی جائے، اگر یہ ڈانٹ ڈپٹ بھی کام نہ آئے تو اس صورت میں اس لڑکے کو علاحدہ کردینے میں کوئی حرج نہیں، خصوصاً اگر اس کا اثر دوسرے طالب علموں میں پھیل جانے کا اندیشہ ہو''۔(اسلامی نظام تعلیم ص:۷۶)

ابن خلدون لکھتے ہیں:

''تعلیم میں سختی خصوصا چھوٹے بچوں کے لیے سخت مضر ہے، طالب علم کی تربیت کا دارومدار سختی پر ہوگا تو اس کا انبساط ونشاط فنا ہوجائے گا۔ اور یہ سختی اس میں بھی کاہلی پیدا کرے گی، اور سزا سے بچنے کے لیے اس کو جھوٹ، فریب اور نفاق کی طرف مائل ہونا پڑے گا۔ اور یہ چیزیں اس کی ایک عادت بلکہ اس کا خلق بن جائے گی''۔(۷۷)

امام غزالی فرماتے ہیں:

''طلبہ کو بداخلاقی سے اشارہ، کنایہ میں جہاں تک ہوسکے روکا جائے، اور اس کی تصریح نہ کی جائے، اور مہربانی کا طریقہ رکھا جائے، ڈانٹ ڈپٹ نہ کی جائے، کیوں کہ تصریح ہیبت کا پردہ چاک کردیتی ہے''۔(۷۸)

ان اقتباسات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلامی نظام تعلیم میں تادیب کا طرز وطریقہ کیا ہے۔

عصر حاضر میں بچوں کی تادیب کے وقت ان امور کا لحاظ رکھا جائے:

(۱) سزا دینے سے پہلے یا دینے کے بعد بچے کو اس کے جرم اور اس کی سنگینی کا احساس دلایا جائے۔

(۲) سزا کا مقصد اصلاح ہو انتقام نہیں۔

(۳) سزا بقدر جرم ہو نہ کم نہ زیادہ۔

(۴) سزا کے کچھ آسان طریقے بھی اپنائے جاسکتے ہیں، مثلاً حساس طلبہ کے لیے خفگی کا اظہار کرنا، کسی کاہل طالب علم سے زیادہ تحریری کام لے لینا، چھٹی کے بعد مجرم طلبہ کو روک کر بٹھالینا، وغیرہ۔

نظام امتحان:

عہد قدیم میں باضابطہ امتحان کا کوئی نظم نہیں تھا۔ ہاں قدیم زمانے میں اس کا کچھ سراغ ملتا ہے، چنانچہ بیجاپور میں عادل شاہ نے نظام تعلیم کے کچھ اصول بنائے تھے جن کے اندر سالانہ امتحان کا ذکر ملتا ہے۔ (اسلامی نظام تعلیم ۷۹) عہد قدیم میں امتحان و آزمائش کا عمل دوران درس درسگاہ ہی میں ہوتا تھا، اساتذہ درس کے درمیان طالب علموں سے آزمائشی سوالات کرتے تھے، اگر جواب مشکل ہوتا تو طلبہ کو ایک ایک ہفتے تک مہلت دی جاتی کہ اس درمیان تیار ہو کر اس سوال کو حل کریں۔ (اسلامی نظام تعلیم ۱۲۳)

عصر حاضر میں امتحانات دو طرح کے ہوتے ہیں، داخلی امتحان جس کا انتظام مدرسہ خود کرتا ہے، بیرونی امتحان جو کسی بورڈ کے تحت ہوتا ہے، بورڈ کے تحت ہونے والا امتحان سال بھر میں ایک بار ہوتا ہے۔ جب کہ مدرسے کا اپنا امتحان دو بار، سہ ماہی و نو ماہی کی صورت میں چار بار ہوتا ہے۔

امتحان کے دو طریقے رائج ہیں تحریری، تقریری۔ تحریری امتحان میں تمام کتابوں کا پرچے کے ذریعے امتحان ہوتا ہے، جبکہ تقریری امتحان میں زبانی طور سے سوال و جواب ہوتا ہے۔ تحریری امتحان میں بھی دو طرح کے سوالات مرتب کیے جاتے ہیں، سبجیکٹو، آبجیکٹو۔

ان امتحانات کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اساتذہ کو اپنی محنتوں اور کوششوں کے اثر کا اندازہ ہو جائے، تاکہ وہ نظام تعلیم، طریقۂ تعلیم اور طرز تربیت میں بقدر ضرورت تبدیلی کر سکیں، طلبہ کو اپنی صلاحیت کا اندازہ ہو جائے تاکہ وہ اور محنت کر کے صلاحیت میں صلابت پیدا کریں اور والدین کو اپنے بچوں کی ترقی یا تنزلی کا اندازہ ہو سکے۔

مندرجہ بالا نظام امتحان اگرچہ سودمند اور تعلیمی معیار کی بہتری میں کافی حد تک معاون ہے تاہم اس سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا ہے کہ اس نظام امتحان میں چند کمیاں بھی ہیں، مثلاً طلبہ کتاب کو کم از کم پڑھنا چاہتے ہیں تاکہ مقدار تعلیم کم رہے تو امتحان دینے میں آسانی رہے، طلبہ امتحان ہی کو مقصد تعلیم سمجھ لیتے ہیں، ان کی محنت و مشقت کا محور صلاحیت سازی کے بجائے امتحان ہوتا ہے، امتحانی پرچوں میں اگر مشکل سوالات آگئے اور طالب علم ان کے جوابات نہیں لکھ سکا تو وہ خود کو بے صلاحیت، حقیر اور ناکارہ سمجھنے لگتا ہے، جس سے

اس کے اندر قنوطیت کے اثرات پیدا ہونے لگتے ہیں، طالب علم کتاب کو سمجھنے کے بجائے رٹنے پر زیادہ زور دیتا ہے، امتحان میں صرف فنی جانچ ہوتی ہے، طالب علم کی دیگر صلاحیتوں کا امتحان نہیں ہو پاتا ہے، ان خامیوں کے پیش نظر چند امور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے:

(۱) امتحان کو مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ذریعہ سمجھا جائے۔ (۲) شخصیت کے سارے پہلوؤں کی جانچ ہو۔ (۳) امتحان کو ہَوَّا اپنانے کے بجائے اسے ہلکے پھلکے انداز میں لیا جائے، سوالات ایسے مرتب کیے جائیں جن سے صرف یادداشت ہی نہیں بلکہ طالب علم کی سوجھ بوجھ، طریقۂ استدلال، طرز فکر اور علمی گہرائی و گیرائی کا اندازہ بھی ہو سکے۔ (۴) ممتحنین دیانت داری کے ساتھ کاپی جانچنے کا کام کریں۔ (۵) پرچوں میں غیر درسی سوالات بھی کیے جائیں۔ (۶) امتحان خوشگوار ماحول میں لیا جائے۔ (ملخصا فن تعلیم و تربیت ۲۹۶)

کچھ مدارس میں داخلے کے لیے بھی باضابطہ تحریری یا تقریری امتحان ہوتا ہے، اس امتحان میں بھی وہی اصول اپنائے جائیں جو عام امتحانات میں اپنائے جاتے ہیں، مکمل جائزہ کے بعد ہی طالب علم کو داخل مدرسہ کیا جائے، اس کی لیاقت کے مطابق درجے کا تعین کیا جائے، سورش سفارش سے بچوں کا داخلہ نہ کیا جائے، اس سے مدرسے کے تعلیمی معیار پر برا اثر پڑتا ہے۔

نظام تعطیل:

قدیم زمانے میں ہفتے میں دو یوم کی رخصت ہوتی تھی ایک منگل کو اور دوسری جمعہ کو۔ بعض محققین کے مطابق دو شنبے کو بھی چھٹی ہوتی تھی، علاوہ ازیں تیوہاروں کے مواقع پر نیز موسمی تعطیلات کا بھی تصور ملتا ہے۔ (اسلامی نظام: ۸۰)

عصر حاضر میں ایڈیڈ دینی مدرسوں میں مدرسہ تعلیمی بورڈ کی فہرست کے مطابق تعطیلات ہوتی ہیں، اور نان ایڈیڈ مدارس میں مجلس منتظمہ کی مرضی کے مطابق۔

سب سے لمبی تعطیل رمضان المبارک میں ہوتی ہے، اس کے علاوہ موسم سرما و گرما میں بھی حسب ضرورت چھٹیاں ہوتی رہتی ہیں۔

ان تعطیلات کے فائدے بھی ہیں اور نقصانات بھی۔ فائدے یہ ہیں کہ طلبہ کے

اندر مسلسل پڑھنے سے جو تکان یا بے نشاطی کی کیفیت پیدا ہوتی ہے وہ دور ہو جاتی ہے، دوبارہ ان کے اندر نئی امنگ، نیا جوش، اور نشاط پیدا ہو جاتا ہے۔ غیر درسی مشاغل میں حصہ لینے کا موقع مل جاتا ہے، مدرسے سے باہر کی دنیا میں رہنے اور سماجی زندگی جینے کی فرصت مل جاتی ہے، والدین کی شفقت و محبت سے ان کے اندر خود اعتمادی اور احساس ذمہ داری پیدا ہوتا ہے۔

ان چھٹیوں کے نقصانات یہ ہیں کہ تعلیمی تسلسل ٹوٹ جاتا ہے، چند دن کی چھٹیاں کئی دنوں کی محنت پر پانی پھیر دیتی ہیں، عموماً رمضان المبارک کی تعطیل میں طلبہ گھر جا کر سال بھر کا لکھا یا پڑھا یا بھول جاتے ہیں۔

اس لیے ان تعطیلات کو کارآمد بنانے کے لیے درج ذیل امور پر توجہ دی جائے:
(۱) تعطیلات ضرورت بھر کم سے کم ہوں۔ (۲) تعطیل میں طلبہ کو ہوم ورک کے طور پر کچھ ایسے درسی کام دیے جائیں جن سے تعلیم کا سلسلہ چلتا رہے۔ (۳) ان کے لیے کچھ کتابوں کا مطالعہ لازم کر دیا جائے تا کہ پڑھی ہوئی باتیں نہ بھولیں۔ (۴) والدین ان چھٹیوں میں اساتذہ کا کردار ادا کریں۔ (۵) چھٹیوں میں بچوں کو تجرباتی امور کا مشاہدہ کرایا جائے۔

نظام رہائش:

اس سے پہلے میں نے عرض کیا کہ نظام تعلیم کے تیسرے دور میں باضابطہ طلبہ کے لیے مدارس میں اقامت گاہوں کا قیام عمل میں آیا، اس کے بعد طلبہ و اساتذہ کی باہمی معاشرت کا آغاز ہوا، اس سے پہلے طلبہ یا تو سرائے خانوں میں یا مساجد کے حجروں میں یا اپنے گھر پر، یا اساتذہ کے گھر پر رہ کر تعلیم حاصل کرتے تھے۔

عصر حاضر میں والدین کی عدیم الفرصتی، خاندانی انتشار، اور مدارس کے مخصوص مزاج تعلیم کے باعث دینی مدارس کے اکثر طلبہ دار الاقاموں میں رہ کر تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان ہاسٹلوں میں طلبہ کے رہنے، کھانے، پینے، سونے، لائٹ وغیرہ کا انتظام ہوتا ہے۔

موجودہ دور میں ان ہاسٹلوں میں طلبہ کی رہائش سے کیا فائدے ہیں اور کیا نقصانات ہیں یہ سب پر واضح ہیں، یہاں چند باتیں عرض کر کے اس بحث کو ختم کر رہا ہوں۔

دار الاقامہ آبادی سے ہٹ کر کھلی جگہ پر ہو، دار الاقامہ میں صفائی ستھرائی کا خاص اہتمام کیا جائے، جو اساتذہ دار الاقامے میں قیام کریں وہ باوقار، نماز و روزے کے پابند،

سنن و مستحبات پر عمل پیرا، اور اخلاق و معاشرت کے اصولوں پر گامزن ہوں، اساتذہ لڑکوں کی مکمل نگرانی کریں، لڑکوں پر یہ پابندی عائد کی جائے کہ دارالاقامہ سے بلاضرورت باہر نہ جائیں، غیر مہذب لوگوں کو ہاسٹل میں آنے سے روکا جائے، لڑکوں میں باہمی معاشرت اور معاونت و مشاورت کا جذبہ بیدار کیا جائے، چھوٹے اور بڑے بچوں کو الگ الگ رکھا جائے، ایک نظام الاوقات بنا کر اس کی پابندی کرائی جائے۔

نظام تعلیم کی بہتری کے لیے کچھ اہم امور کا لحاظ:

(۱) مخلص اور دیانت دار اراکین:

ہر دینی ادارے میں دو طرح کی کمیٹی ہوتی ہے، عاملہ، شوریٰ، ان میں سب سے زیادہ متحرک، فعال اور سرگرم مجلس عاملہ ہوتی ہے۔ دونوں کے اراکین کا انتخاب درج ذیل صفات کا لحاظ رکھ کر ہو تو مدارس میں مزید ترقی اور تعلیمی بہتری کی امید کی جاسکتی ہے۔

اراکین خدا ترس ہوں، ایماندار ہوں، ٹرسٹ سے ان کا کوئی مفاد وابستہ نہ ہو، خوشحال ہوں کہ وہ ٹرسٹ میں کوئی خرد برد نہ کرسکیں، قوم کے حالات سے آگاہ ہوں، پبلک سے ربط و ضبط رکھنے والے ہوں۔

(۲) لائق اساتذہ کی تقرری:

عصر حاضر میں دینی مدارس میں بالخصوص سرکاری امداد یافتہ مدارس میں اساتذہ کی تقرری میں کن امور کا لحاظ رکھا جاتا ہے یہ جگ ظاہر ہے۔ یہاں پر میں ایک اچھے استاذ کی خوبیوں کے بیان پر اکتفا کرتا ہوں۔

اچھا مزاج، مہربانی، صبر، غیر جانب داری، صاف طور سے بیان کرنے کی لیاقت، نظم و ضبط کی پابندی، مضمون کا علم، احساس ظرافت، جماعت کے باہر شاگردوں کی امداد، ایمانداری، اچھی شخصیت، قوت ارادی، قوت رہبری، اچھی آواز، شاگردوں کی کمزوریوں کی فہم۔ (ثانوی مدارس میں تدریس ص ۶۹۷)

خاص طور سے دینی مدارس کے اساتذہ میں یہ اوصاف ہونے چاہئیں:

عقائد و نظریات اور عملی زندگی کے لحاظ سے صالح ہونا، دینی علوم میں لیاقت کے ساتھ عقائد و افکار کے لحاظ سے مسلمان ہونا، باطل عقائد سے مرعوب نہ ہونا، قناعت پسندی، ایثار، اور حریص نہ ہونا، اپنے اہل و عیال کو شریعت کی پابندی کرانا۔ (فن تعلیم و تربیت، ص ۱۷۶)

علاوہ ازیں خوف خدا، وقار، متانت، اخلاق رذیلہ سے اجتناب، احترام علم، چھوٹے پیشوں سے اجتناب، مواقع تہمت سے اجتناب، مشاغل کی پابندی اور اوقات کی حفاظت، مطالعہ کا استمرار اور طلبہ پر شفقت جیسی صفتیں ایک اچھے استاذ کی علامت ہیں۔ (اسلامی نظام تعلیم، ص:۸۸)۔

(۳) غیر ضروری اور مضر ایجادات سے اجتناب کی تاکید:

عصر حاضر میں نت نئی ایجادات نے جہاں انسانی زندگی کو راحت وآسائش پہونچائی ہے وہیں ان کے کچھ مضر اور نقصان دہ اثرات بھی ہیں، انہیں ایجادات میں سے موبائل بھی ہے، جو بہت عام استعمال کی چیز ہے، سادہ موبائل کا استعمال بہت زیادہ مضر نہیں، لیکن ملٹی میڈیا سیٹ کے استعمال سے طلبہ کے اندر جو خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں وہ مستقبل میں بہت تکلیف دہ ہیں۔ طلبہ کے اخلاق بری طرح سے متاثر ہو رہے ہیں۔ ان کا وقت، پیسہ، صحت، سب ضائع ہو رہے ہیں، رشتوں کا تقدس پامال ہو رہا ہے، فحاشی اور عریانیت عام ہوتی جا رہی ہے، دینی مدارس جہاں پر فرشتے ہجوم کیے رہتے ہیں وہیں پر موبائل کی مدد سے جو مخرب اخلاق حرکتیں ہو رہی ہیں وہ نہایت شرم وندامت کی بات ہے، اس لیے ہمیں طلبہ کو اس موبائل کے مفید ومضر پہلو کو بتانا ہوگا، ان پر دوران تعلیم خاص طور سے ہاسٹل کی زندگی میں ان پر سخت پابندی عائد کرنی ہوگی۔ موبائل کا مقصد اصلی بات کرنا ہے، اس لیے مدرسے میں لینڈ لائن فون یا خاص موبائل سیٹ ہو جس پر طلبہ اپنے اہل خانہ یا عزیز واقارب سے حسب ضرورت بات کرلیں۔ ان کے پاس موبائل بالکل نہ رہنے دیا جائے، اور اگر ہو تو بس سادہ سیٹ۔

(۴) نشے کی لت پر پابندی:

دینی مدارس کے طلبہ میں نشے کی لت عام ہو رہی ہے۔ پان گٹکھا، تمباکو، سگریٹ تمباکو والا منجن، یہ سب ہمارے طلبہ کی صحت، اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو بری طرح سے متاثر کر رہے ہیں، اس لیے ان پر سخت پابندی عائد کر کے طلبہ کی نگرانی کی جائے اور طلبہ کو ان چیزوں کی ضرر سے آگاہ کیا جائے۔

(۵) تعلیمی مسابقوں کا انعقاد:

کسی بھی میدان میں مسابقہ انسان کے اندر ''کچھ زیادہ'' کرنے کا حوصلہ پیدا

کرتا ہے، بہتر سے بہتر کارکردگی پر ابھارتا ہے، اس لیے دینی مدارس کے طلبہ میں سال بھر میں کم از کم دو بار تحریری، تقریری، اور مطالعہ جاتی مسابقوں کا انعقاد ضروری ہے۔ کچھ مدارس مثلاً جامعہ اشرفیہ، دارالعلوم علیمیہ، جامعہ احسن البرکات مارہرہ شریف اور فیض الرسول براؤں شریف میں اس طرح کے مسابقوں کا انعقاد ہوتا ہے، جس کا خاطر خواہ فائدہ محسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ مسابقے مدرسہ کی سطح پر، یا ضلعی سطح پر یا صوبائی اور ملکی سطح پر بھی کیے جاسکتے ہیں۔

(۶) بزم ادب کا اہتمام:

بہت سے دینی مدارس میں بزم ادب کا رواج ہے، اس سے مراد ہفتہ واری طلبہ کا اجتماع ہے جس میں تقریر، نعت خوانی دعا وغیرہ ہوتی ہے۔ ان محفلوں کو اور زیادہ کارآمد بنایا جاسکتا ہے بشرطیکہ یہ مجالس ذمہ دار استاذ کی نگرانی میں ہوں، ان میں جنرل اور شرعی مسائل کی جانکاری دی جائے، طلبہ کے سامنے معاشرتی زندگی کے اہم پہلوؤں پر کسی خاص استاذ کے ذریعے توسیعی خطبات پیش کیے جائیں۔

(۷) وال میگزین کی اشاعت:

مدارس میں وال میگزین کی اشاعت کی روایت بھی جاری ہے۔ یہ جدار یے طلبہ کے لیے قلمی مشق کا بہترین سامان ہیں، بہت سارے طلبہ انھیں جداریوں کے فیض سے بہترین قلم کار بنے ہیں، اس لیے ان جداریوں کی اشاعت جاری رہنی چاہیے، ہاں ان کی اشاعت میں ان امور کا لحاظ کیا جائے، کسی ماہر قلم کار استاد سے اشاعت سے پہلے بچوں کے مضامین کو جانچ کر طلبہ کی تحریری خوبیوں اور خامیوں کی اصلاح کر کے موقع کی مناسبت سے مضامین لکھوائے جائیں، اچھا مضمون لکھنے پر ان کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ سال کے عمدہ مضامین کو ملکی جرائد و رسائل میں اشاعت کے لیے بھیجا جائے۔

(۸) اساتذہ میں اتحاد و اتفاق:

بہترین اور معیاری تعلیم و تربیت کے لیے ضروری ہے کہ اساتذہ میں اتفاق و اتحاد، باہمی مشاورت اور آپسی معاونت ہو تاکہ اچھی پلاننگ کے ساتھ طلبہ کی تعلیم و تربیت ہو سکے، اس کے بغیر نہ تو طلبہ کے اندر تعلیمی بہتری آئے گی، نہ ہی ان کی تربیت کی کوئی تحریک کامیاب ہو سکتی ہے۔

(۹) عمدہ نظام الاوقات کی تشکیل:

نظام الاوقات سے مراد جماعت اور گھنٹی وار، اساتذہ کے پاس کتابوں کی تقسیم۔
نظام الاوقات کی ترتیب میں ان امور کا لحاظ رکھا جائے:

ہر مضمون کو اہمیت کے اعتبار سے وقت دیا جائے، مشکل کتابوں کو ابتدائی گھنٹیوں میں رکھا جائے، ہر کتاب اسی استاذ کے پاس رکھی جائے جو اس کو پڑھانے سے دلچسپی رکھتا ہو، نظام الاوقات کی تشکیل سے پہلے اساتذہ کی رائے ضرور لے لی جائے کہ وہ کیا پڑھانا چاہتے ہیں، ہر استاذ کی کم از کم ایک گھنٹی خالی رکھی جائے، ہر گھنٹی کے ٹائم کی پابندی کرائی جائے، طلبہ درس گاہ میں وقت پر جائیں اور وقت پر استاذ انہیں چھوڑ دے۔

(۱۰) تدریسی ٹریننگ:

اچھے اور تجربہ کار اساتذہ قوم کے مستقبل کو سنوارتے ہیں۔ کسی بھی نظام تعلیم کے روح رواں ہوتے ہیں، اس لیے مستقبل کے لیے اچھے اور تجربہ کار اساتذہ کو تیار کرنے کی سمت میں اقدام کرنا ہوگا۔ اس کا بروقت آسان حل یہ ہے کہ مدرسے کے فارغین میں جو تدریسی ذوق رکھتے ہیں، باضابطہ وظیفے کے ساتھ ان کو تدریسی ٹریننگ دی جائے، یہ کورس دوسالہ ہو، کورس کی تکمیل پر سند دی جائے۔

واضح رہے کہ چند بڑے مدارس میں اس کا آغاز ہو چکا ہے۔

(۱۱) دوسالہ تخصص کا کورس کرانا:

درجۂ فضیلت کے بعد دوسالہ فقہ، ادب، یا تقابل ادیان میں تخصص کا اہتمام کیا جائے۔

ان امور کے علاوہ بھی بہت ساری باتیں ہیں جن کو اپنا کر دینی مدارس کے نصاب و نظام تعلیم کو قدیم نافع اور جدید صالح کا سنگم بنایا جاسکتا ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں ان کا احاطہ مشکل ہے۔ بروقت مذکورہ تجاویز پر غور کرنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت ہے۔

مصنف کی دیگر تصنیفات